تہذیب کی فکری جہات اور مکاتیبِ اقبال

ڈاکٹر جمیل الرحمٰن

This research article has two parts. In first part the meaning and concept of civilization and culture have been elaborated in the light of different literally persons i.e. Dr. Daud Rehber, Dr. Jamil Jalibi, Dr. Anees Nagi and other western thinkers who unfolded the knots of different types and schools of thought toward civilization. Islamic and Western concepts are major elements of current scenario. The second part of article is about the letters of Iqbal in which other than poetic and philosophical writings, Iqbal had thrown light on the cultural aspects in his letters. A parallel and comparative study comes before the reader. Iqbal's letters are full of his great attention towards Islamic culture, values, personalities and through these letters we learn about the clashes of Western and Eastern civilizations, having different shades of rural and urban life. Iqbal has showed his utmost desire in these letters for revival of Islamic culture that unfortunately has been disappeared with socio-political decline of the Islamic World.

''تہذیب'' عربی الاصل لفظ ہے جس سے لغوی طور پر درخت تراشنا، کاٹنا اور اصلاح کرنے کے معانی لیے جاتے ہیں۔ مرادی سطح پر اس کے وسیع معنی ہیں اور تہذیب کے ڈانڈے تمدن، کلچر اور اسلوب حیات کے تمام پہلوؤں سے جا ملتے ہیں۔[1]

ڈاکٹر داود رہبر نے کلچر (تہذیب، ثقافت، تمدن) کے مفہوم کو کھولتے ہوئے لکھا ہیں:

جڑی بوٹی کو اکھاڑ کر اس کی جگہ کھیت، پھلوں کا باغ یا پھولوں کی کیاری بنانا کلچر ہے۔ جھاڑی کو قینچی سے کانٹ چھانٹ کر اس کی صورت بنانا کلچر ہے۔ علی ہذا القیاس۔ پھل یا پھول کو پیوندی کرنا، بال تراش کر ترچھی مانگ نکالنا، ڈاڑھی مونچھ مونڈ کر اپنی صورت بدلنا، اون اور روئی کو کات کر اس کے دھاگوں سے کپڑا بننا اور اس کا لباس بنانا، آرام کے لیے تکیے اور گدے بنانا، دودھ سے دہی، مکھن اور پنیر بنانا، گنے کے رس سے شکر اور شکر سے مٹھائیاں تیار کرنا، مرغ اور بکرے کو بھون کر کباب کھانا، پتھر اور دھات کے زیور گھڑنا، پتھر کو تراش کر صنم کی

صورت دینا، مٹی کو پکا کر برتن اور اینٹ بنانا، عمارت کھڑی کرنا، سڑک تیار کرتا۔ یہ ساری باتیں کلچر ہی تو ہیں۔[۲]

ڈاکٹر جمیل جالبی نے ثقافت اور تہذیب کے الفاظ کو 'کلچر' کے لفظ میں یکجا کر دیا ہے اور ان کے نزدیک کلچر (تہذیب وثقافت کا مجموعہ) ایک ایسا لفظ ہے جو زندگی کی ساری سرگرمیوں کو خواہ وہ ذہنی ہوں یا جسمانی، خارجی ہوں یا داخلی احاطہ کر لیتا ہے۔[۳] کیا کلچر کے پیدا کرنے اور اسے برابر ترویج دینے میں چند اصول و ضوابط وضع کر لینا کافی ہوگا؟ اس سوال کو انیس ناگی نے رد کیا ہے اور کلچر کو ایک معاشرتی عمل قرار دیا ہے:

> کلچر ایک اسلوبِ زیست ہے جس میں معاشرے کے خواب اور ہوش کی جملہ وارداتیں شامل ہوتی ہیں۔ کلچر ایک معاشرے کی باطنی تنظیم کا مظہر ہوتا ہے جو ایک معاشرتی عمل اور جغرافیائی حدود اربعہ اور مذہبی روایات اور رسوم سے اپنے خدوخال مرتب کرتا ہے۔ ان تمام عناصر میں مختلف طبقات کی ضروریات جدلیاتی عمل کو جنم دیتی ہیں۔ چنانچہ اس طرح معاشرہ اپنے مجموعی اسلوب کی تنظیم کا قرینہ فراہم کرتا ہے۔ کلچر کو منشوروں یا ہدایات کے ذریعے پیدا کیا جانا ممکن نہیں ہے۔[۴]

کلچر جن عناصر سے ترتیب پاتا ہے ان میں رہنے سہنے کے طریقے، کھانے پینے کے آداب، میل جول کے آداب دید وادید کے رسوم، وضع داری، قرابت داری، رسوم ورواج شادی بیاہ، میلے کے تہوار، اجتماعی شوق اور مجلسی تفریحات، ذوقی مشاغل بزم آرائی (محافل موسیقی وشعر گوئی)، مصوری، کھیل، شکار، پرندوں کی تربیت، آرائش وزیبائش اور فنون لطیفہ، فنون مفیدہ (صناعات) شامل ہیں۔[۵] کسی بھی قوم کی تہذیب یا ثقافت مصنوعی طریقوں کے بجائے فطری ماحول اور فطری انداز میں پروان چڑھتی ہے، ثقافت کا استحکام معاشرہ، افکارِ عظیمہ (Dominant Ideas) اور ثقافتی مظاہر سے ہی مربوط ہے۔ تہذیب وثقافت کا انسانی زندگی میں انفرادی اور اجتماعی سطح پر گہرا اثر پایا جاتا ہے۔ انفرادی اور اجتماعی نفسیات کے پیچھے اس فرد یا قوم کی تہذیب کام کر رہی ہوتی ہے۔ گویا زندہ رہنے کے لیے جس طرح سانس لینے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اتنا ہی سماجی ثقافتی نظریے کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر روتھ بینی ڈکٹ کے نزدیک:

> علم رسوم۔۔۔۔۔ لمحۂ ولادت ہی سے وہ رسوم جن میں وہ پیدا ہوا ہے اس کے تجربے اور طرزِ عمل کی تشکیل کرنے لگتی ہے۔ جب وہ بولنا شروع کرتا ہے تو اس وقت تک وہ اپنی ثقافت کی پروردہ ایک ننھی سی مخلوق بن چکا ہوتا ہے۔ جب وہ بلوغت کو پہنچتا ہے اور اپنی ثقافت کی سرگرمیوں میں عملی حصہ لینے کے قابل ہو جاتا ہے تو اس وقت تک اس کی ثقافت کی عادات اپنی عادات، اس کی ثقافت کے عقائد، اس کے اپنے عقائد اور اس کی ثقافت کے ناممکنات اس کے اپنے ناممکنات بن چکے ہوتے ہیں۔۔۔۔۔ کوئی معاشرتی مسئلہ ایسا نہیں ہے جس کا جاننا ہمارے لیے اتنا ضروری اور ناگزیر ہو جتنا رسم کا یہ عمل۔ جب تک ہم رسم کے قوانین کو نہ سمجھیں گے اس وقت تک انسانی زندگی کے پیچیدہ حقائق ورموز ہماری سمجھ سے بالاتر رہیں گے۔[۶]

تہذیب کا دائرہ عمل بہت پھیلا ہوا ہے اور یہ مذہب، دین، رسوم و رواج، عقائد، توہمات، موت و

حیات، اخلاق و آداب کے علاوہ سیاست، معاشرت، معیشت، علم و ادب اور سائنسی کارناموں تک محیط ہے۔ گویا ایک منزل پر پہنچ کر تہذیب ان تمام الفاظ کا مجموعہ بن جاتی ہے جو اس سے الگ سمجھے جاتے ہیں۔[۷] ثقافتی سائنسدانوں نے تہذیب کو فعلیت کی بنیاد پر جن اقسام میں تقسیم کیا ہے ان میں اوزار سازی، مصوری، ستر پوشی، ظروف سازی، رنگ آفرینی، زراعت، نظامِ غذا، نظامِ طب، روشنی اور آگ کی تسخیر اور تعمیرات شامل ہیں۔ تہذیب کو سمجھنے اور سہولت پیدا کرنے کے لیے سوروکن نے ان نمونوں کا ذکر کیا ہے:

۱۔ حواسی کلچر/ مادی (مغربی تہذیب)
۲۔ تخیلی کلچر/ غیر مادی (غیر مرئی اور روحانیت پر ایقان)
۳۔ مثالی کلچر/ امتزاجی (حواسی اور تخیلی کلچر کا امتزاج)[۸]

تہذیبی مباحث میں دلچسپی لینے والوں کے لیے یہ امر دلچسپی سے خالی نہیں کہ دیگر مادی، غیر مادی عوامل کے ساتھ تہذیب اور مذہب کا چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔ جدید دور کا انسان بھی اس حقیقت سے منھ نہیں موڑ سکتا کہ مذہب نے انسانی قلب و روح کو بالیدگی، پاکیزگی اور ارتقائی جمال سے مالا مال کیا ہے۔ جہاں انسانی ذہن گھٹن کا شکار ہو کر انسانوں کو تہذیب و ثقافت کی آڑ میں جغرافیائی حد بندیوں، نسلی تفاخر اور غیر عقلی تعصّبات کی بنا پر انسانی وحدت کو پارہ پارہ کرنے پر تلا ہوا ہے۔ وہاں مذہب تہذیبِ انسانی کا واحد اور بلاتفریق پیامبر بن کر سامنے آتا ہے اور تہذیبی تصادم سے دوچار ہونے کی بجائے عالمگیر انسانیت پر زور دیتا ہے۔ انسان پھر تمام تر تکثیریت اور بوقلمونیوں کے باوجود یکتائی کی لڑی میں پرویا ہوا نظر آتا ہے۔ ٹالسٹائی، لاگرینج (Lagrange)، جون آر۔ ایورٹ، ٹی ال، فلامارین، رابرٹسن سمتھ، مکس ملر، جوزف مازینی، ارنسٹ رینان، اوون پالو، نپولین وغیرہ نے مذہب اور دین کے مثبت تعمیری اثرات کو کھلے دل سے تسلیم کیا ہے۔ حتیٰ کہ کارل مارکس نے ایک مادی فلسفی اور دین و معنوی اعتقادات کا منکر ہوتے ہوئے بھی اپنی کتاب 'سرمایہ' میں دین و مذہب کی تمدن ساز حیثیت کو تسلیم کیا ہے۔[۹] مذہب کی عطا کردہ تہذیب امن و امان، ثقافت، نظم و نسق اور آزادی کی ضامن ہے۔ مذہب اور تہذیب نظری مباحث کی چیزیں نہیں ہیں۔ اس کے رنگ کو انسانی کردار و عمل اور سماج میں ظاہر ہونا لازم ہے۔ اس تہذیبی اطلاق کا ذکر ڈاکٹر داور رہبر نے اپنی کتاب 'کلچر کے روحانی عناصر' میں کرتے ہوئے لکھا ہے:

> دوسری ملتوں اور قوموں کے روحانی ورثوں کی واقفیت سے اپنی روحانی میراث کی انفرادیت کا پتہ ملتا ہے۔۔۔۔ مسجدوں، گرجوں، شوالوں اور آتش کدوں میں عبادات کی کیا رسوم ادا ہو رہی ہیں۔ یہ جاننا بھی ضروری ہے۔ لیکن اس تحقیق سے زیادہ مفید اس بات کی تحقیق ہوگی کہ ''من مندروں'' کے اندر کیا ہو رہا ہے۔ غلام حسین کا ضمیر جس حال میں ہے اس کا تعلق اسلام سے کیا ہے، شورانی کا ضمیر جس حال میں ہے اس کا تعلق

ہندومت سے کیا ہے، کرسٹوفر کا ضمیر جس حال میں ہے اس کا تعلق مسیحیت سے کیا ہے، جگجیت سنگھ اور نریندر کور کا ضمیر جس حال میں ہے اس کا تعلق سکھ مت سے کیا ہے، غرض یہ کہ فرد کے ضمیر کا حال دریافت کرنے سے معلوم ہوگا کہ دینی تعلیمات کا اثر اس کے ایمان پر کتنا اور کیسا ہوا۔[۱۰]

'اہل الاحوال' اپنی اقسام اور حیثیتوں دونوں طرح ہر بڑی ملت، قوم میں یکساں ہیں جس سے ثقافتی اختلاف کی بجائے مماثلت کا عنصر بڑھ جاتا ہے۔ تمام پیشے اور تمام رشتے تمام مذاہب، اقوام میں بالعموم یکساں ہیں تو پھر کلچر میں اختلاف کی شدت بڑھنے کے بجائے اخذ و قبول سکھاتی ہے۔ اکنافِ عالم میں متعدد تہذیبیں ابھریں۔ ان تہذیبوں میں ایک نام اسلامی تہذیب کا بھی ہے جو اپنے مزاج اور اعتقاد کی بنیاد پر ایک علاحدہ تشخص کی حامل ہے۔ اسلامی کلچر کا دامن اس لحاظ سے بڑا وسیع اور فراخدلانہ ہے کہ یہ کسی بھی مثبت اور صحت مندانہ رجحان کو اپنے اندر جذب کر لینے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اسلامی تہذیب کے یہ تین اصول ہیں:

۱۔ توحید اور بیعت کبریٰ کی اجتماعی تعمیر
۲۔ ختم نبوت
۳۔ عقیدہ حیات بعد الموت

تہذیبی رویوں کے حوالے سے اقبال کا نقطہ نظر بڑا واضح ہے۔ اقبال کا تمام تر زاویہ نظر فکری ہے اور فکری دائرہ کار ہی سے ان کے دوسرے رویے مرتب ہوتے ہیں۔ اس لیے جب وہ تہذیبی رویوں کے بارے میں غور کرتے ہیں تو اس وقت بھی ان رویوں کے پیچھے موجود فکری اجزا ہی ان کی توجہ کا مرکز بنتے ہیں۔ جیلانی کامران نے تہذیب کے حوالے سے اقبال کے تین نقطہ ہائے نظر کی طرف توجہ دلائی ہے:

اوّل: مسلمانوں کی عظمتِ رفتہ
دوم: عہدِ حاضر کی مغربی تہذیب کا منظر نامہ
سوم: مستقبل بینی[۱۱]

فرد اور معاشرے کے انفرادی اور اجتماعی اعمال اور کردار سے ہی کسی قوم کی تہذیب بنتی، بگڑتی، عروج و زوال کا شکار ہوتی ہے۔ اقبال کے خیال میں تاریخی شعور (ماضی، حال اور مستقبل کا اشتراک) تہذیبی رویے کے طور پر قابلِ قبول ہوسکتا ہے۔ اقبال کی نظر میں تہذیب ایک اجتماعی عمل اور اجتماعی ذمہ داری ہے لہٰذا اجتماعی وحدت فنِ تعمیر، ادب، شاعری، علوم اور فنون و سپاہ گری سے جہاز رانی، ایجاد و دریافت، تمدنی اداروں اور اندازِ حکمرانی تک اپنا اظہار پاتی ہے اور انسان اس امر سے آگاہ ہوتا ہے کہ ایک نئی دُنیا ظاہر ہوئی ہے اور جہانِ نو کے باوجود پانے کی خبر عام ہوئی ہے۔[۱۲]

اقبال کا فلسفہ حرکت اور عمل سے عبارت ہے۔ انسان تو کجا نباتات، حیوانات اور جمادات کے مقدر اور

درجہ کا فیصلہ بھی حرکت اور عمل سے جڑا ہوتا ہے۔ اقبال کی اسی سوچ میں ابنِ مسکویہ (وفات ۱۰۳۰ء) بھی ان کے ہمنوا ہیں۔ اقبال لکھتے ہیں کہ ابنِ مسکویہ نے علمِ نباتات کو بھی اپنے غور و فکر کا موضوع بنایا تھا۔ انھوں نے حیوانات اور نباتات کے مابین فرق بیان کرتے ہوئے نقل و حمل کو اہم قرار دیا اور اشارہ کیا ہے کہ ہم نباتات ،حیوانات کتنے مقابلے میں مخلوقات کے درجے میں کمتر ہیں کہ وہ زمین میں پیوست ہیں اور حیوانات کا زمین کے ساتھ ایسا رشتہ نہیں ہے۔ اس مشاہدے کی بنا پر ابنِ مسکویہ زمین کے ساتھ پیوستگی کو آزادی سے محرومی تصور کرتے ہیں۔[۱۳]

بدقسمتی سے اقبال کے عہد کے مسلمان فراموش کر بیٹھے اور تہذیبِ مغرب کی جانب دریوزہ گری کی نگاہ کیے بیٹھے تھے کہ شاید ایک جرعہ انھیں مل جائے اور ان کی پیاس بجھ جائے۔ یہ پیاس تو کیا بجھنی تھی تشنگی میں اور اضافہ ہوتا چلا گیا۔ ایسے میں اقبال ساقی گری کرتے ہوئے کہتے ہیں:

بیا اقبال جامے از خمستان خودی درکش
تو از میخانہ مغرب ز خود بیگانہ می آئی[۱۴]

اے اقبال! ہمارے پاس آؤ اور خودی کا ایک جام پی کر دیکھو، تم نے مغرب کے میخانے سے تو جی بھر کر پی مگر اپنے میخانے سے بےالتفاتی برتی۔

اقبال تہذیبِ مغرب کے مثبت اور منفی پہلوؤں سے بخوبی آگاہ تھے۔ اقبال مغربی تہذیب کی اندھی نقالی کو امتِ مسلمہ کے حق میں زہرِ قاتل سمجھتے تھے۔ ان کے خیال میں مغرب انسانی سماج کی آئیڈیالوجی سے خالی اور محروم تہذیب کا نام ہے۔

تہی وحدت سے ہے اندیشۂ غرب
کہ تہذیبِ فرنگی بے حرم ہے[۱۵]

اقبال نے اپنی شاعری اور نثری تحریروں میں نہ صرف تہذیبِ مشرق و مغرب کا تقابل اور موازنہ کیا بلکہ تاریخی، سماجی اور تہذیبی روّیوں کے نشانات سے تہذیبِ اسلامی کی مابہ الامتیاز خصوصیات کو اجاگر کرنے میں اپنی صلاحیتیں صرف کر دیں۔ اقبال کے خطوط سے ان کی زندگی کے روزمرہ معاملات میں ان کے تہذیبی رویوں کی بخوبی عکاسی ہوتی ہے۔

اقبال کی رومانی فطرت کا خمیر امتِ مسلمہ، ملتِ بیضا سے اٹھا تھا اور وہ زندگی کے تمام معاملات میں پلٹ کر اس عہدِ مقدسہ کے روشن دور کی جانب دیکھتے ہیں۔ یہ وہ اسلامی تہذیب تھی جس نے سرزمینِ عرب کو ہی نہیں بلکہ پوری دنیا کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ اقبال شعوری اور لاشعوری طور پا اسلامی اور مشرقی تہذیب کے مختلف پہلو اپنے خطوط میں بیان کرتے چلے جاتے ہیں۔ اقبال کا تہذیبی مطالعہ مشرق و مغرب کے حوالے سے

یک طرفہ نہیں رہا تھا انھوں نے اقوامِ عالم کے تہذیبی سفر کا بالاستیعاب مطالعہ کیا تھا۔ وہ بڑے فخر سے اسلامی تہذیب کی ضیا پاش کرنوں سے قلب ونظر کو روشن کرتے ہیں۔ ادب کی دنیا ہو یا پھر روحانی سفر، معیشت ہو یا سیاست، قانون وتعزیر کی بحثیں ہوں یا علم الابدان کے معاملات، وہ رہ رہ کر اسلام کی ثقافتی قوت کو پورے اعتماد کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ اقبال زندگی بھر مختلف جسمانی عوارض کا شکار رہے اور صحت وتندرستی کے لیے انگریزی ادویات (ایلو پیتھک طریقہ علاج) کا استعمال کرتے تھے وہاں انھوں نے ہندوستان کے مشہور اطبّا حکیم نابینا، حکیم اجمل خاں، حکیم فقیر محمد چشتی وغیرہ کی حکمت سے بھی بھرپور استفادہ کیا۔ اس کا سبب وہ مشرقی علوم اور مشرقی تہذیب کی دلآویزی تھی جس کا وہ برملا اظہار کرتے ہیں کہ مشرقی تہذیب اور اسلامی تہذیب میں رائج طبی طریقہ علاج میں جہاں ادویات کی شیرینی، لذت اور زود اثریت کو دخل حاصل ہے وہاں اس طریقۂ علاج میں روحانیت، پاکیزگی، خدا خوفی، توکل، تقویٰ اور خلوص کے اجزا بھی شامل ہوتے ہیں۔ ایک مقام پہ لکھتے ہیں:

> طبیب جب نسخہ تجویز کرتا ہے تو سرنامے پر ''ھوالشافی'' ضرور لکھتا ہے۔ ڈاکٹر ایسا نہیں کرتا۔ بظاہر یہ ایک رسم ہے ایک معمول یا ایک روایت۔ لیکن اسے کچھ بھی کہیے، یہی مظاہر ہیں کسی تہذیب کی حقیقی روح، مزاج اور ایمان وایقان کے۔ یوں ہی پتہ چلتا ہے کہ کسی قوم کا تصورِ انسان کائنات اور خالق کائنات کے بارے میں کیا ہے، یوں ہی اس کی روشِ حیات متعین ہوتی اور جذبات واحساسات ایک مخصوص رنگ اختیار کرتے ہیں یوں ہی اس کی سیرت وکردار اپنے ایک جداگانہ نصب العین پر مرکوز ہو جاتی ہے۔ اسے محض رسم، معمول یا روایت نہ کہیے۔ ان باتوں کا زندگی سے گہرا تعلق ہے۔ یہی باتیں ہیں جن سے قوموں کے ذوقِ حیات اور تہذیب و ثقافت کی ترجمانی ہوتی ہے۔ جب تک کوئی قوم اپنے نصب العین پر قائم رہتی ہے، اپنی روایات کو زندہ رکھتی ہے اور اپنے اصل الاصول سے پیچھے نہیں ہٹتی عوام بے رہرو نہیں ہونے پاتی۔ خواص ان کی رہنمائی کرتے ہیں قوم کے وجودِ ملی کو تقویت پہنچتی اور وہ اپنی ترقی اور کامرانی کی منزلوں میں باامید واعتماد آگے بڑھتی بلکہ دوسروں کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ [۱۶]

شہری اور دیہی انداز بود وباش، خورد ونوش کا ذکر وہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> میں نے یورپ کے مشہور حکیم کی کتاب میں دیکھا ہے کہ جو شخص ہر روز لسی پیا کرے اس کی عمر بڑھتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسان کے جسم میں ایسے جراثیم ہیں جو قاطعِ حیات ہیں اور دہی کی لسی ان جراثیم کے بمنزلہ زہر کے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گاؤں کے رہنے والے لوگ شہریوں کی نسبت عموماً طویل العمر اور تندرست ہیں۔ علی بخش نے کل مجھے بتایا کہ اس کی چچی کی عمر لمبی ہوئی اور آخر میں اس کی گزران زیادہ تر لسی پر تھی۔ [۱۷]

اقبال نے ایام جوانی میں کئی شہروں، ملکوں کے سفر کیے اور اس عہد کے مشاہدات کو اپنے خطوط میں جگہ دی۔ مولوی انشاء اللہ کو اپنے محسوسات میں شریک کرتے ہوئے خط میں لکھتے ہیں:

> اے عرب کی مقدس سرزمین، تجھ کو مبارک ہو! تو ایک پتھر تھی جس کو دنیا کے معماروں نے رد کر دیا تھا مگر ایک یتیم

بچے نے خدا جانے تجھ پر کیا افسوں پڑھ دیا کہ موجودہ دنیا کی تہذیب وتمدن کی بنیاد تجھ پر رکھی گئی! باغ کے مالک نے اپنے ملازموں کو مالیوں کے پاس پھل کا حصہ لینے کو بھیجا لیکن مالیوں نے ہمیشہ ملازموں کو مار پیٹ کر کے باغ سے باہر نکال دیا اور مالک کے حقوق کی کچھ پروانہ کی۔ مگر اے پاک سرزمین، تو وہ جگہ ہے جہاں سے باغ کے مالک نے خود ظہور کیا تاکہ گستاخ مالیوں کو باغ سے نکال کر پھولوں کو ان کے نامسعود پنجوں سے آزاد کرے۔ تیرے ریگستانوں نے ہزاروں مقدس نقش قدم دیکھے ہیں اور تیری کھجوروں کے سائے نے ہزاروں ولیوں اور مسلمانوں کو تمازت آفتاب سے محفوظ رکھا ہے۔ کاش میرے بدکردار جسم کی خاک تیرے ریت کے ذروں میں مل کر تیرے بیابانوں میں اڑتی پھرے اور یہی آوارگی میری زندگی کے تاریک دنوں کا کفارہ ہو! کاش میں تیرے صحراوں میں لٹ جاوں اور دنیا کے تمام سامانوں سے آزاد ہو کر تیری تیز دھوپ میں جلتا ہوا اور پاوں کے آبلوں کی پروانہ کرتا ہوا اس پاک سرزمین میں جا پہنچوں جہاں کی گلیوں میں بلال کی آواز گونجتی تھی۔[۱۸]

اقبال کا ملتِ بیضا سے تعلق خاطر عشق کی بلندیوں تک پہنچا ہوا تھا۔ اکبرالہ آبادی کے صاحبزادے کا نام ہاشم تھا اس مناسبت سے برسرِ تذکرہ وہ رسول ہاشمی سے اپنی نسبت اور عقیدت کا اظہار اس خط میں کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ہاشم طال عمرہ کو میری طرف سے بہت بہت پیار کیجیے۔ میری روح کو اس نام سے ایک خاص تعلق ہے۔ اللہ تعالیٰ اس بچے کی عمر دراز کرے اور دین ودنیا میں اسے بامراد کرے۔ سکول کی خواندگی میں اس کا وقت ضرور ضائع ہوتا ہوگا مگر باوجود اس کے کس قدر خوش نصیب لڑکا ہے کہ پیرانِ مشرق سے فیض کی نظر لے رہا ہے۔۔۔۔۔ اب کوئی دن جاتا ہے کہ پیرانِ مشرق دنیا میں نہ رہیں گے اور آیندہ زمانے کے مسلمان بچے نہایت بدنصیب ہوں گے۔ میاں ہاشم! اب وقت ہے اس کی قدر کرنا اور جو کچھ پیر مشرق سے لے سکتے ہو لے لینا۔ یہ وقت پھر نہیں آئے گا۔ اس تربیت کے فیض سے زندگی بھر تمھاری روح لذت اٹھائے گی۔''[۱۹]

یہ اشارہ اس روحانی تہذیب کی طرف ہے کیوں کہ مغرب کی تہذیب اس نورِ فیض سے خالی ہے جو ایک بیٹا اپنے باپ کی شفقت بھری نگاہوں سے حاصل کرتا ہے۔ مغرب کی مادی اور حسی تہذیب اس روحانیت سے خالی ہے جس کے بارے میں اکبرالہ آبادی نے کہا تھا:

گفت ہاشم بے سبب ز انگلش مرا اکراہ نیست
ہر کتابے را کہ بکشادیم بسم اللہ نیست

ہاشم نے کہا کہ انگریزی زبان سے مجھے بے سبب نفرت نہیں ہے۔ جس کتاب کو بھی کھول کر دیکھا اس میں بسم اللہ ندارد۔[۲۰]

زندگی اور موت کے تمام مراحل میں مشرق ومغرب کا اپنا اپنا مزاج اور رویہ ہے۔ اس سے تمام تر معنویت تغیر کا شکار ہوتی ہے۔ وگیے ناسٹ کے والد کی وفات پر اقبال تعزیت نامے میں اس طرح اظہار

کرتے ہیں کہ مشرق و مغرب کے نزدیک فلسفۂ حیات و ممات نکھر کر سامنے آ جاتا ہے۔ اقبال کے الفاظ میں:

اس خبر سے مجھے حقیقتاً بے حد دکھ ہوا ہے اور میں خدا تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ اس بزرگ اور قابلِ احترام ہستی پر اپنے انعام و اکرام کی بارش کرے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ یہ وہ آیت مقدسہ ہے جو ہم کسی کی وفات کی خبر سن کر پڑھتے ہیں اور آپ کا غم اندوز خط پڑھ کر میں نے یہ آیت بار بار دہرائی۔۔۔۔ آپ کو یاد ہوگا کہ گوئٹے نے اپنے لمحۂ موت میں کیا کہا تھا: ''مزید روشنی'' موت مزید روشنی کی طرف ایک نئی راہ وا کرتی ہے اور ہمیں ان مقامات تک لے جاتی ہے جہاں ہم ابدی حسن و صداقت کے روبرو کھڑے ہو جاتے ہیں۔[۲۱]

اسی طرح عطیہ فیضی کو اسی مضمون کے ذیل میں لکھتے ہیں:

بلاشبہ ہر شخص کے لیے زندگی موت کے انتظار کا نام ہے۔ میں بھی اگلے جہان کی سیر کا آرزومند ہوں۔ وہاں پہنچ کر چاہتا ہوں کہ اپنے خالق کی زیارت کروں اور اس سے تقاضا کروں کہ میری ذہنی کیفیت کی عقلی وضاحت کی جائے۔[۲۲]

اسلامی تہذیب میں خدا کے حضور سجدہ ریز ہونے اور قلبی ارتفاع کی یافت کو عبادت کا نام دیا جاتا ہے۔ ایک جماعت کی شکل میں نماز، روزہ اور حج کی ادائیگی اس یگانگت کا ثبوت ہے جو مغربی تصورِ قومیت اور لادینی تصورات سے ماورا ہے۔ اقبال نے اسی بنا پر امت مسلمہ کو تمام تہذیبوں اور مذاہب سے منفرد اور ممتاز قرار دیا تھا۔

ع خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمیؐ

اپنے استاد پروفیسر آرنلڈ کی ننھی بیٹی نینسی آرنلڈ کو بڑی خوب صورتی سے لکھتے ہیں:

یہ رہا ریاضی کا ایک مسئلہ تمہارے لیے: وہ تمام مرد (اور عورتیں) جو دلی کی مسجد میں مصروف نماز ہیں، ذرا ان کو گن کر تو دکھاؤ اقبال۔[۲۳]

مولانا گرامی ایک استعارے کے طور پر پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

مسلمانوں کا کعبہ کے طواف سے متحد ہونا اور اس مرکز توحید کا قوم کے قلوب کے کیفیات کو ایک کر دینا ایک مشکل مضمون ہے۔ اس کو اس شعر میں ادا کیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے اور اچھا ہو تو داد دیجیے۔

ملت بیضا ز طوفش ہم نفس
ہم چو صبحِ آفتاب اندر قفس

مندرجہ بالا مضمون کے علاوہ طواف کعبہ کا نظارہ اور مسلمانوں کا اس کا محافظ ہونا بھی اس میں مخفی ہے۔[۲۴]

بدقسمتی سے نوجوانانِ اسلام اپنی اصل سے عدم واقفیت کی بنا پر تہذیبِ مغرب کے اسیر نظر آتے ہیں۔ اقبال کو اس کا شدید قلق تھا۔ مولانا گرامی کو لکھتے ہیں کہ انھوں نے کس طرح اس خیال کو منظوم کیا:

......جن مسلمان نوجوانوں نے اپنا لباس، زبان، فیشن وغیرہ بدل لیا ہے ان کو مخاطب کر کے لکھا ہے۔

فکرِ تو زنجیری افکار غیر
در گلوئے تو نفس از تار غیر

بر زبانت گفتگوہا مستعار
در دلِ تو آرزوہا مستعار
قمریانت را نواہا ساختہ
سروہایت را قباہا خواستہ
آں نگاہش سرِّ ما زاغ البصر
سوے قوم خویش باز آید اگر
می شناسد شمع او پروانہ را
نیک داند خویش و ہم بیگانہ را
''لست منی'' گویدت مولاے ما
وائے ما اے وائے ما اے وائے ما!

۱۔ تمھارا فکر افکارِ غیر کا غلام۔ تمھارے گلے میں دوسروں کے تار سے سانس آ رہا ہے۔
۲۔ تمھاری زبان پر مستعار گفتگو ہے، تمہارے دلوں میں مانگی ہوئی تمنائیں ہیں۔
۳۔ تمھاری قمریوں کی نوا مستعار ہے، تمہارے سرو کی قبا بھی۔
۴۔ وہ نگاہ جو مازاغ البصر کا راز ہے اگر قوم کو دوبارہ مل جائے۔
۵۔ تو اس کی شمع پروانے کو پہچانتی ہے۔ وہ اپنے بیگانے کو خوب جانتی ہے۔
۶۔ ''تو مجھ سے نہیں'' ہمارے آقا تجھ سے کہتے ہیں۔ افسوس ہم پر، صد افسوس ہمارے حال پر)[۲۵]

اسی خیال کو مولانا شوکت علی کے نام خط میں پیش کیا ہے۔ یہ پیغام امت مسلمہ کے نوجوانوں اور علی گڑھ کے طلبہ کے لیے ہے۔ اقبال امت مرحومہ کے تہذیبی احیاء کے لیے دردمندی کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

..........علی گڑھ والوں سے میرا اسلام کہیے۔ مجھے ان سے غائبانہ محبت ہے اور اس قدر کہ ملاقات ظاہری سے اس میں کچھ اضافہ ہونے کا امکان بہت کم ہے۔ یہ چند اشعار میرے طرف سے ان کی خدمت میں عرض کر دیجیے۔
والسّلام

کبھی اے نوجواں مسلم تدبر بھی کیا تو نے
وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا
تجھے اس قوم نے پالا ہے آغوشِ محبت میں
کچل ڈالا تھا جس نے پاوں میں تاجِ سرِ دارا
تمدن آفریں خلّاق آئینِ جہاں داری
وہ صحرائے عرب، یعنی شتربانوں کا گہوارا

سماں ''الفقر فخری'' کا رہا شانِ امارت میں
بآب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روئے زیبا را
گدائی میں بھی وہ اللہ والے تھے غیور اتنے
کہ منعم کو گدا کے ڈر سے بخشش کا نہ تھا یارا
غرض میں کیا کہوں تجھ سے کہ وہ صحرا نشیں کیا تھے
جہاں گیر و جہاں دار و جہاں بان و جہاں آرا
اگر چاہوں تو نقشہ کھینچ کر الفاظ میں رکھ دوں
مگر تیرے تخیل سے فزوں تر ہے وہ نظارا
تجھے آبا سے اپنے کوئی نسبت ہو نہیں سکتی
کہ تو گفتار، وہ کردار، تو ثابت وہ سیارا
گنوا دی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی
ثریّا سے زمیں پر آسماں نے ہم کو دے مارا
حکومت کا تو کیا رونا کہ وہ اک عارضی شے تھی
نہیں دنیا کے آئینِ مسلّم سے کوئی چارا
مگر وہ علم کے موتی کتابیں اپنے آبا کی
جو دیکھو ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارا
غنی روزِ سیاہے پیرِ کنعاں را تماشا کن
کہ نورِ دیدہ اش روشن کند چشمِ زلیخا را[۲۶]

مشرق و مغرب ایک مدت تک باہم دست و گریباں رہے۔ یہ جنگ ہلال و صلیب یعنی مسلمانوں اور عیسائیوں کے مابین چھڑی رہی۔ ہلال و صلیب کے نشانات دو تہذیبوں اور رویوں کے غماز ہیں۔ اقبال نے نشانِ ہلال کے مسلم دنیا میں آغاز بارے محققانہ انداز میں غازی عبدالرحمٰن کو خط میں لکھا ہے:

......نشان ہلال کی تاریخ میں اختلاف ہے۔ جہاں تک مجھے علم ہے یہ نشان نبی کریمؐ اور صحابہؓ کے عہد میں مروج نہ تھا۔ بعض مغربی مورخین نے لکھا ہے کہ فتحِ قسطنطنیہ سے شروع ہوا۔ بعض سلطان سلیم کے عہد میں بتاتے ہیں مگر یہ صحیح نہیں۔ میرے خیال میں ترکوں کو اس کی ترویج سے کوئی تعلق نہیں۔ غالباً صلیبی لڑائیوں کے زمانے میں اس کی ترویج شروع ہوئی (صلیبی جنگوں کے تذکرے میں بھی اس کا ذکر ملتا ہے) اور کچھ عجب نہیں کہ صلاح الدین ایوبی کے زمانے سے اس کا آغاز ہوا ہو۔۔۔۔۔۔ صلیبی سپاہی اپنے سینوں، لباسوں اور علموں پر صلیب

کا نشان رکھتے تھے۔ امتیاز کے واسطے مسلمانوں نے یہ نشان شروع کر لیا۔ اس واسطے کہ اس میں ہر روز بڑھنے کا اشارہ تھا۔ ہلال کا لفظ ہی نمو کا اشارہ کرتا ہے اس کے علاوہ کوئی صورت نہیں۔[۲۷]

مشرق و مغرب میں عورتوں کے بارے میں عزت و تکریم کے الگ پیمانے ہیں۔ اسلام میں عورت کا کردار بہ حیثیت ماں، بہن، بیٹی اور بیوی کے طے شدہ ہے۔ ان رشتوں کے علاوہ کوئی رشتہ حلت اختیار نہیں کرتا۔ مغرب نے حقوقِ نسواں اور آزادی کے نام پر وہ استحصال کیا کہ اس کی شخصیت اور وجود ہی بے معنی، مسخ شدہ اور بے چہرہ ہو گیا۔ اقبال کی نظر میں دخترِ رسول حضرت فاطمۃ الزہراؓ مسلمان عورتوں کے لیے ایک اسوۂ کاملہ ہے۔ اقبال حضرت مریمؑ پر حضرت فاطمہؓ کی برتری ثابت کرنے کے لیے اس نازک خیالی سے کام لیتے ہیں:

...... یہ کہ احترام و عزت اگر نسبتوں پر موقوف ہے تو مریمؑ کو صرف ایک نسبت حاصل تھی یعنی یہ کہ وہ مسیح کی ماں تھی مگر فاطمہؓ:

نور چشم رحمۃ للعالمین
آں امام اولین و آخرین
آنکہ جاں در پیکر گیتی دمید
روزگار تازہ آئین آفرید
زوجۂ آن تاجدار ھل اتی
مرتضیؓ مشکل کشا، شیرِ خدا
بادشاہ و کلبۂ ایوانِ او
یک حسام و یک زرہ سامان او
مادر آں کاروانِ سالار عشق
رونق ہنگامۂ و یک زرہ عشق
در نوائے زندگی سوز از حسین
اہل حق حریت آموز از حسین[۲۸]

ستم یہ ہے کہ مغرب جو کبھی عیسائیت اور دیگر مذاہب کی آماجگاہ تھا اب سائنسی ترقی، ٹیکنالوجی، مادیت پسندی، اور زر پرستی کی چکا چوند میں اندھا ہو چکا ہے اور اس کا پہلو روحانیت سے خالی ہو گیا ہے۔ مغرب کو مادیت پرستی کی قیمت قلب و نظر کی ویرانیوں کی صورت چکانا پڑ رہی ہے۔ مغرب کی تاریخ میں ایسا بھی وقت گزرا ہے کہ وہ روحانی بالیدگی اور ترقی کے لیے مبالغہ آمیز انتہاؤں کو اختیار کیے ہوئے تھے۔ رہبانیت کی شکل میں وہ ان حلال، طیب اور جائز اسباب سے بھی دست کش ہو چکے تھے۔ گویا یہ وہ پہلی انتہا تھی اور دوسری انتہا توازن،

اعتدال کی بجائے نری مادیت پسندی پہ ختم ہوئی۔ اسلامی تصوف کی عجمی تعبیر کے اقبال بھی سخت ناقد تھے اور انھوں نے تصوف کی ابتدا، ماخذات کی نشاندہی کے ساتھ اسلامی، غیر اسلامی، مشرقی، غیر مشرقی عناصر کو الگ الگ کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے دکھایا ہے کہ باطنیت، روحانیت کا موید تصوف عیسائی رہبانیت اور یونانی فکر سے کس قدر متاثر ہے۔ خواجہ حسن نظامی کے نام خط میں لکھتے ہیں:

رہبانیت عیسائی مذہب کے ساتھ خاص نہیں بلکہ ہر قوم میں پیدا ہوتی ہے اور ہر جگہ اس نے شریعت اور قانون کا مقابلہ کیا ہے اور اس کے اثر کو کم کرنا چاہا ہے۔ اسلام حقیقت میں اسی کے خلاف ایک صدائے احتجاج ہے۔ تصوف جو مسلمانوں میں پیدا ہوا (اور تصوف سے میری مراد ایرانی تصوف ہے) اس نے ہر قوم کی رہبانیت سے فائدہ اٹھایا اور ہر راہبی تعلیم کو اپنے اندر جذب کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہاں تک کہ قرامطی تحریک سے بھی تصوف نے فائدہ اٹھایا ہے محض اس وجہ سے کہ قرامطی تحریک کا مقصد بھی بالآخر قیودِ شرعیہ اسلامیہ کو فنا کرتا تھا۔ بعض صوفیا کی نسبت تاریخی شہادت بھی اس امر کی موجود ہے کہ وہ قرامطی تحریک سے تعلق رکھتے تھے۔[۲۹]

ایک اور مقام پر انھوں نے تصوف کے ڈانڈے یونانی تہذیب سے ملائے ہیں۔ خان محمد نیاز الدین خاں کے نام یہ خط توجہ کا متقاضی ہے:

''مخدومی! السلام علیکم

الحمدللہ کہ آپ نے مثنوی کو پسند فرمایا۔ سید ولی اللہ شاہ صاحب کا رسالہ میں نے دیکھا ہے۔ یہی افلاطونیت جدید ہے جس کا اشارہ میں نے اپنے مضمون میں کیا ہے۔ فلسفہ افلاطون کی ایک بگڑی ہوئی صورت ہے جس کو ایک پیرو (PLOTINUS) نے مذہب کی صورت میں پیش کیا۔ عیسائیت کی ابتدائی صدیوں میں رومی دنیا میں یہ مذہب نہایت مقبول تھا۔ اس کی آخری حامی ایک عورت تھی (HYPATIA) نام، جس کو عیسائیوں نے ہی مصر میں نہایت بے دردی سے قتل کرا دیا تھا۔ مسلمانوں میں یہ مذہب حرّان کے عیسائیوں کے تراجم کے ذریعہ سے پھیلا اور رفتہ رفتہ مذہبِ اسلام کا ایک جزو بن گیا۔ میرے نزدیک یہ تعلیم قطعاً غیر اسلامی ہے اور قرآن کریم کے فلسفے سے اسے کوئی تعلق نہیں۔ تصوف کی عمارت اسی یونانی بے ہودگی پر تعمیر کی گئی۔ والسلام

آپ کا خادم
محمد اقبال[۳۰]

مشرق کی دنیا میں خواجۂ حافظ کی متصوفانہ، رندانہ اور جذب و کیف و مستی سے سرشار شاعری نے ایک ہنگامہ بپا کیے رکھا۔ اقبال جو خود جذبِ دروں کی لذت سے آشنا تھے وہ بھی خواجۂ حافظ کے سحر میں ایک عرصہ تک مبتلا رہے لیکن جب اسے خالصتاً اسلامی، شرعی اور نتائجیت کے اعتبار سے جانچا پرکھا تو انھوں نے اسے مسلمانوں کے لیے بالخصوص اور دیگر نفوس کے لیے بالعموم زہرِ قاتل سمجھا۔ وہ اپنی شاعری، خطوط، خطبات اور کچھ دوسری تحریروں کے ذریعے اس زہر شیریں سے خبردار کرتے رہے۔ ایک تجدد آفریں ذہن کے حامل اقبال

ہمیشہ مشرقی تہذیب کے متصوفانہ پہلو پر نظر ثانی کی ضرورت پر زور دیتے رہے۔ اس سلسلے میں ان کو اپنے دوستوں سے بھی بہت کچھ سننا پڑا لیکن انھوں نے جس بات کو حق سچ جانا اسے بے خوف ہو کر دن کی روشنی میں دنیا کو دکھایا۔ مہاراجہ کشن پرشاد کے نام خط میں انھوں نے خواجہ حافظ کی شاعری کا غیر جانبدارانہ محاکمہ کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

> حافظ کی شاعری کا میں معترف ہوں۔ میرا عقیدہ ہے کہ ویسا شاعر ایشیا میں آج تک پیدا نہیں ہوا اور غالباً پیدا بھی نہ ہوگا لیکن جس کیفیت کو وہ پڑھنے والے کے دل پر پیدا کرنا چاہتے ہیں وہ کیفیت قوائے حیات کو کمزور و ناتواں کرنے والی ہے۔ یہ ایک نہایت طویل اور دلچسپ بحث ہے جو اس مختصر خط میں سما نہیں سکتی۔ میں نے مسلمانوں اور ہندووں کی گذشتہ دماغی تاریخ اور موجودہ حالت پر بہت غور کیا ہے جس سے مجھے یقین ہو گیا ہے کہ ان دونوں قوموں کے اطبا کو اپنے مریض کا اصلی مرض اب تک معلوم نہیں ہو سکا۔ میرا عقیدہ ہے کہ ان کا اصلی مرض قوائے حیات کی ناتوانی اور ضعف ہے اور یہ ضعف زیادہ تر ایک خاص قسم کے لٹریچر کا نتیجہ ہے جو ایشیا کی بعض قوموں کی بدنصیبی سے اس میں پیدا ہو گیا۔ جس نکتہ خیال سے یہ قومیں زندگی پر نگاہ ڈالتی ہیں وہ نکتہ خیال صدیوں سے مضعف مگر حسین و جمیل ادبیات سے محکم ہو چکا ہے اور اب حالاتِ حاضرہ اس امر کے مقتضی ہیں کہ اس نکتہ خیال میں اصلاح کی جائے۔[۳۱]

اقبال کے نزدیک تصوف کا وجود طبیعت میں سوز و گداز کی کیفیت پیدا کرنے کے لیے بہت عمدہ ہے اس کے دوسرے پہلو بھی دلچسپ اور جاذب ہیں لیکن وہ مباحث جو عملی کم اور نظری زیادہ ہیں اقبال کی نظر میں گمراہ کن ہیں۔ یہ گمراہی تہذیبی اضمحلال تک جا پہنچتی ہے۔ خان محمد نیاز الدین خاں کے نام خط میں لکھتے ہیں:

> تصوف کے ادبیات کا وہ حصہ جو اخلاق و عمل سے تعلق رکھتا ہے۔ نہایت قابلِ قدر ہے کیونکہ اس کے پڑھنے سے طبیعت پر سوز و گداز کی حالت طاری ہوتی ہے۔ فلسفہ کا حصہ محض بے کار ہے اور بعض صورتوں میں میرے خیال میں تعلیمِ قرآن کے مخالف۔ اسی فلسفے نے متاخرین صوفیہ کی توجہ صور و اشکالِ غیبی کے مشاہدہ (کی) طرف کر دی اور ان کا نصب العین محض غیبی اشکال کا مشاہدہ بن گیا۔۔۔۔۔ مسلمانوں کی حالت آج بالکل ویسی ہے جیسے کہ اسلامی فتوحات ہندوستان کے وقت ہندوؤں کی تھی، یا ان فتوحات کے اثر سے ہو گئی۔ ہندو قوم کو اس انقلاب کے زمانے میں منو کی شریعت کی کورانہ تقلید نے موت سے بچا لیا۔ اپنی شریعت کی حفاظت کی وجہ سے ہی یہودی قوم اس وقت تک زندہ ہے ورنہ اگر فیلو (پہلا یہودی متصوف) قوم کے دل و دماغ پر حاوی ہو جاتا تو آج یہ قوم دیگر اقوام میں جذب ہو کر اپنی ہستی سے ہاتھ دھو چکی ہوتی۔[۳۲]

اس وقت مغربی تہذیب کا تغلب پوری دنیا پہ چھایا ہوا ہے۔ تاریخِ عالم میں وہ وقت بھی گزرا جب اسلامی تہذیب نے مغرب کو بہ لحاظ تمام مسخر کر لیا تھا۔ اس وقت کی اسلامی تہذیب ایک رجحان ساز تہذیب تھی لیکن اس کے انہدام میں کون سے اسباب کارفرما تھے اس پر اقبال نے پردہ اٹھاتے ہوئے لکھا ہے:

> یورپ میں اسلام کا سیاسی زوال بدقسمتی سے کہا جاتا ہے ایسے وقت میں رونما ہوا جب مسلم حکما کو اس حقیقت کا

احساس ہونے لگا تھا کہ استخراجی علوم لایعنی ہیں اور جب وہ استقرائی علوم کی تعمیر کی طرف کسی حد تک مائل ہو چکے تھے۔ دنیائے اسلام میں تحریکِ ذہنی عملاً اس وقت سے مسدود ہو گئی اور یورپ نے مسلم حکما کے غور و فکر کے ثمرات سے بہرہ اندوز ہونا شروع کیا۔ یورپ میں جذبۂ انسانیت کی تحریک بڑی حد تک ان قوتوں کا نتیجہ تھی جو اسلامی فکر سے بروئے کار آئیں۔ یہ کہنا مطلق مبالغہ نہیں ہے کہ جدید یورپین جذبۂ انسانیت کا جو ثمر جدید سائنس اور فلسفہ کی شکل میں برآمد ہوا ہے، اسے کئی لحاظ سے محض اسلامی تمدن کی توسیع پذیری کہا جا سکتا ہے۔ اس اہم حقیقت کا احساس نہ آج کل کے یورپین کو ہے اور نہ مسلمانوں کو۔ کیونکہ مسلمان حکما کے جو کارنامے محفوظ ہیں وہ ابھی تک یورپ، ایشیا اور افریقہ کے کتب خانوں میں منتشر اور غیر مطبوعہ شکل اور حالتوں میں ہیں۔ آج کل کے مسلمانوں کی جہالت کا یہ عالم ہے کہ جو کچھ ایک بڑی حد تک خود ان کے تمدن سے برآمد ہوا ہے وہ اسے بالکل غیر اسلامی تصور کرتے ہیں۔[۳۳]

اقبال کی فکر مادی اور روحانی عناصر پہ مبنی تہذیب کی پرچارک ہے۔ ان کے نزدیک مشرق و مغرب کو نری مادیت اور روحانیتِ محض کی غیر عقلی خلیجوں میں بانٹنا انسانیت کے لیے خسرانِ عظیم ثابت ہو سکتی ہے۔ مذہب ہی دین و دنیا کی فلاح و ترقی کا ضامن ہے۔ نئی نسل کے نام ان کا یہ پیغام تھا:

جرمنی کے مشہور پیغمبری شاعر گوئٹے نے اپنے معاصر جوانوں کے روحانی اضطراب و بے چینی کا مشاہدہ کر کے ان کو یہ پیغام دیا تھا۔

ART STILL HAS TRUTH
TAKE REFUGE THERE

اس وقت اسلامی دنیا کی وہی حالت ہے جو نپولین کے وقت جرمنی کی تھی اور میرا پیغام بھی مسلمان نوجوانوں کے لیے وہی ہے جو اس نے دیا تھا صرف اس قدر فرق ہے کہ میں نے ART کی جگہ لفظ RELIGION رکھ دیا ہے اور اس کی وجہ ظاہر ہے۔ آرٹ میں اطمینان ضرور ہے مگر قوت نہیں ہے۔ مذہب میں اطمینان اور قوت دونوں چیزیں ہیں۔[۳۴]

اقبال نے ہمیشہ تہذیب کو قلب و نظر کی پاکیزگی سے تعبیر کیا اور یہ پاکیزگی تہذیبِ مغرب سے قطعاً حاصل نہیں ہو سکتی کیوں کہ اُن کی رائے میں فرنگی تہذیب ہمیشہ فسادِ قلب و نظر کا باعث رہی۔ ایسی تہذیب کی بدولت ایک باوقار معاشرے کے خواب کی تعبیر ممکن نہیں۔

فسادِ قلب و نظر ہے فرنگ کی تہذیب
کہ روح اس مدنیت کی رہ سکی نہ عفیف
رہے نہ روح میں پاکیزگی تو ہے ناپید
ضمیرِ پاک و خیالِ بلند و ذوقِ لطیف

حوالہ جات وحواشی

۱۔ زوار حسین، تہذیب، بیکن بکس ملتان، ۲۰۰۰ء، ص ۱۵

۲۔ داؤد رہبر، ڈاکٹر، کلچر کے روحانی عناصر، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۲۰۱۴ء، ص ۲۸۱

۳۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، پاکستانی کلچر، نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۱۹۸۵ء، ص ۴۲

۴۔ بحوالہ مضمون ادب اور تہذیبی جمود از ڈاکٹر انیس ناگی، مشمولہ کلچر مرتبہ: اشتیاق احمد، بیت الحکمت لاہور، ۲۰۰۷ء، ص ۲۶۶

۵۔ بحوالہ مضمون اسلامی ہندی کلچر از ڈاکٹر سید عبداللہ مشمولہ کلچر، ص ۲۴۶

۶۔ روتھ بٹی کٹ، ڈاکٹر، نقوش ثقافت، مترجمہ قاسم محمود، سید، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، طبع اول ۲۰۱۲، ص ۲

۷۔ ساجد امجد، ڈاکٹر، اردو شاعری پر بر صغیر کے تہذیبی اثرات، الوقار پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۳ء، ص ۱۲

۸۔ تہذیب، ص ۸۷

۹۔ فخر الدین حجازی، تمدن انسانی پر انبیاء کے اثرات، مترجمہ محمد ریاض، ڈاکٹر، مقبول اکیڈمی لاہور ۱۹۹۴ء، ص ۸۶-۸۷

۱۰۔ کلچر کے روحانی عناصر، ص ۱۳-۱۴

۱۱۔ جیلانی کامران، فکرِ اقبال کے تہذیبی روّیے مشمولہ مضمون منتخب مقالات، اقبال ریویو، مرتبہ: ڈاکٹر وحید قریشی، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، شمارہ جنوری ۱۹۸۳ء، ص ۱۶۶

۱۲۔ ایضاً، ص ۱۶۹

۱۳۔ ایضاً، ص ۱۶۷

۱۴۔ کلیاتِ اقبال، (فارسی)، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور، اشاعت پنجم ۱۹۸۵ء، ص ۳۴۳، پیامِ مشرق ص ۱۷۳

۱۵۔ مولانا غلام رسول مہر، مطالب کلام اقبال اردو، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ص ۳۷۴، بالِ جبریل، ص ۸۲

۱۶۔ سید نذیر نیازی، اقبال کے حضور، اقبال اکادمی، لاہور، طبع اوّل، ۱۹۷۱ء، ص ۳۹۱

۱۷۔ برنی، سید مظفر حسین، (مرتب)، کلیاتِ مکاتیبِ اقبال جلد دوم، ترتیب پبلشرز لاہور، ص ۱۲۵

۱۸۔ کلیاتِ مکاتیبِ اقبال، جلد اوّل، ص ۹۶-۹۷

۱۹۔ ایضاً، ص ۲۲۰-۲۲۱

۲۰۔ ایضاً، ص ۲۲۲

۲۱۔ ایضاً، ص ۲۳۶

۲۲۔ ایضاً، ص ۱۷۷-۱۷۹

۲۳۔ ایضاً، ص ۱۶۰

۲۴۔ ایضاً، ص ۴۶۷-۴۶۸

۲۵۔ ایضاً، ص ۴۳۳-۴۳۴

۲۶۔ ایضاً، ص ۲۷۸

۲۷۔ ایضاً، ص ۲۷۳

۲۸۔ ایضاً، ص ۴۵۰

۲۹۔ ایضاً، ص ۳۴۰

۳۰۔ ایضاً، ص ۳۵۰

۳۱۔ ایضاً، ص ۳۶۷

۳۲۔ ایضاً، ص ۳۵۶

۳۳۔ کلیاتِ مکاتیب اقبال جلد دوم ص ۴۳۶۔۴۳۷

۳۴۔ ایضاً، ص ۲۷۱۔۲۷۲